خواتین کے حقوق اور علماء ہند کی اجتہادی کاوشیں

خالد سیف اللہ رحمانی

مؤرخہ ۱۵-۱۶/اکتوبر ۲۰۱۱ء روز شنبہ، یکشنبہ کو استنبول (ترکی) میں ایک اہم سیمینار اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) اور مرکز البحوث الاسلامیہ (ترکی) کے اشتراک سے منعقد ہوا، جس کا عنوان تھا ''برصغیر اور حکومت عثمانیہ میں فقہ اسلامی کی تطبیق''، جس میں اکیڈمی کی طرف سے مولانا بدرالحسن قاسمی (نائب صدر) مولانا عتیق احمد بستوی (سکریٹری شعبۂ علمی) کے علاوہ پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی، پروفیسر سعود عالم قاسمی، مولانا محمد شاہجہاں ندوی، ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی، ڈاکٹر محمد مبین ازہری ندوی اور مولانا محمد امتیاز عالم قاسمی نے شرکت فرمائی، نیز ترکی سے مختلف اہم شخصیتیں شریک ہوئیں، یہ حقیر بھی اس میں موجود تھا؛ لیکن اپنی علالت کی وجہ سے شریک نہیں ہوسکا، وہی مقالہ ذیل میں بحث ونظر کے قارئین کے لئے پیش ہے۔ (رحمانی)

خواتین کو اللہ تعالیٰ نے حسن ولطافت اور محبت کا پیکر بنایا ہے، یہی خصوصیت ہے جو ان کو مرکزِ توجہ بناتی ہے، اسی لئے باپ کی شفقت سے زیادہ ماں کی ممتا اولاد کو متاثر کرتی ہے، یہ لطافت اور محبت فطری طور پر جسمانی نزاکت کی متقاضی ہوتی ہے، اسی لئے جسمانی اعتبار سے مرد بہ مقابلہ عورت کے طاقتور واقع ہوا ہے، افسوس کہ اس طاقت کا سہارا لے کر تاریخ کے مختلف ادوار میں عورتوں کے ساتھ زیادتی کی جاتی رہی ہے، یہاں تک کہ موجودہ دور ترقی میں بھی آزادی کے نام پر عورت کا استحصال کیا جارہا ہے اور اسے سامانِ تجارت بنادیا گیا ہے۔

محمد رسول اللہ ﷺ جب اس دنیا میں تشریف لائے تو یوں تو آپ نے تمام طبقات کے ساتھ رحم دلی کی تعلیم دی، یہاں تک کہ جانوروں کے ساتھ بھی اور پیڑ پودوں کے ساتھ بھی؛ کیوں کہ آپ ﷺ رحمت للعالمین تھے؛ لیکن دو طبقات اس وقت سب سے زیادہ مظلوم تھے، اس لئے آپ ﷺ نے ان کے حقوق کی حفاظت کی خاص طور پر کوشش فرمائی، ایک: خواتین، دوسرے: غلام، یہ اسلامی تعلیمات ہی کا نتیجہ ہے کہ غلامی کا جو رواج ہزاروں سال سے تھا، اسلام کے آنے کے بعد چند صدیوں میں یہ سلسلہ ختم ہوگیا، عورتوں کے ساتھ بھی حسن سلوک کے سلسلہ میں آپ ﷺ

نے صرف اخلاقی تعلیم ہی نہیں دی؛ بلکہ بنیادی نظریات کی اصلاح بھی کی اور قانونی طور پر ان کے حقوق بھی متعین فرمائے۔

ہندوستان دنیا کا ایک ایسا خطہ ہے، جہاں بعض روایات کے مطابق عہدِ نبوی ہی میں اسلام پہنچ چکا تھا اور عہد فاروقی میں ہندوستان کے ساحلی علاقوں تک اسلام کے پہنچنے کی تو تاریخی شہادتیں موجود ہیں، غرض کہ ہندوستان میں مسلمان طویل عرصہ سے آباد ہیں، کم وبیش ایک ہزار سال انھوں نے پورے ملک پر حکومت بھی کی ہے، جو موجودہ پاکستان سے لے کر بنگلہ دیش اور برما تک کو محیط تھا، فتنۂ تاتار کے دور میں بہت سے اہل علم خطۂ عرب سے یہاں وارد ہوئے اور خود یہاں بھی بڑے بڑے علماء پیدا ہوئے، اس طرح پورا ہندوستان دینی علوم کا مرکز رہا ہے؛ لیکن ہندوستان کے علماء نے سب سے زیادہ جس فن پر توجہ دی ہے، وہ فقہ ہے، جو دراصل کتاب وسنت کا نچوڑ اور اسلامی علوم وافکار کا خلاصہ ہے، اور فقہ میں بھی ہندوستان میں شروع سے ہی فقہ حنفی رائج رہی ہے؛ البتہ بعض ساحلی علاقوں میں شروع سے فقہ شافعی کے متبعین رہے ہیں، ہندوستان میں اہل تشیع بھی ہیں اور ان میں فقہ جعفری ایک مقبول فقہ رہی ہے؛ لیکن شیعوں کی ایک شاخ فرقۂ بواہیر ہندوستان میں عرصہ سے موجود ہے، جن کی اپنی فقہ ہے، بہر حال اس وقت بحیثیت مجموعی فقہ حنفی، فقہ شافعی، فقہ سلفی اور فقہ جعفری پر عمومی طور پر عمل ہے؛ لیکن نوے فیصد مسلمان اہل سنت ہیں اور تقریباً نوے فیصد اہل سنت فقہ حنفی کے متبع ہیں۔

جب تک ہندوستان مسلم حکمرانوں کے زیر اقتدار تھا، وہاں کے حالات بھی دوسرے مسلم ملکوں سے مختلف نہیں تھے؛ لیکن جب اقتدار کی باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئی اور مسلمان ایک مذہبی اقلیت کی حیثیت اختیار کر گئے تو بہت سے ایسے مسائل پیدا ہوئے، جن سے عالم اسلام کے مسلمان دوچار نہیں ہیں، مسلمان اقلیتوں کے مسائل بہ مقابلہ عالم اسلام کے تین جہتوں سے مختلف ہیں، اول یہ کہ مسلم ملکوں میں مسلمان خود نظام زندگی کی تشکیل کرنے کے موقف میں ہیں، جب کہ غیر مسلم ممالک میں مسلمان ایک بنے بنائے نظام کا حصہ ہوتے ہیں، دوسرے: مسلم ملک میں یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ مسلمان احکام شریعت سے زیادہ واقف ہوں گے، غیر مسلم ممالک میں دینی اعتبار سے جہل کا غلبہ ہوتا ہے، اسی لئے فقہاء نے دارالاسلام کو ''دارالعلم'' اور دارالکفر کو ''دارالجہل'' کہا ہے اور یہ بات محتاج اظہار نہیں کہ بہت سے احکام میں جہالت بھی مؤثر ہوتی ہیں؛ اسی لئے جہل کو فی الجملہ 'عوارض اہلیت' میں مانا گیا ہے، تیسرا سبب یہ ہے کہ کوئی بھی گروہ اپنے پڑوسیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، مقامی تہذیب وثقافت کا اثر اس علاقہ میں رہنے والی تمام قوموں پر پڑتا ہے، یہ وہ بنیادی اسباب ہیں جن کی بنا پر مسلمان اقلیتوں سے متعلق بعض ایسے مسائل پیدا ہوئے ہیں، جن سے وہ عالم اسلام میں دوچار نہیں ہوتے، ہندوستان کے مسلمان اگرچہ ایک مستحکم جمہوری نظام کا حصہ ہیں اور یہاں اظہار خیال کی آزادی ہے، نیز ہر گروہ کو اپنے مذہب پر

عمل کی اجازت ہے، تعلیمی اور معاشی ترقی میں بھی بڑی حد تک یکساں مواقع حاصل ہیں، کہا جاسکتا ہے کہ یہ ملک جمہوریت کا اعلیٰ نمونہ ہے؛ لیکن ان سب کے باوجود اس کے حالات بالکل عالم اسلام کی طرح نہیں ہیں اور جن مسائل سے یہاں کے مسلمان دوچار ہوتے ہیں، ان میں سے بہت سے مسائل خواتین سے متعلق ہیں، اس پس منظر میں ہندوستان کے مسلمانوں نے جو کاوشیں کی ہیں اور عورتوں کے مسائل کو حل کرنے کی سعی کی ہے، ان کا مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے :

جبری شادی

شریعت نے نکاح کو عاقدین کے اختیار سے متعلق رکھا ہے، یعنی مرد وعورت کی رضامندی سے ہی نکاح منعقد ہوتا ہے؛ لیکن رضاء اور عدمِ رضاء 'قلب' کا فعل ہے، جس سے آگاہ ہونا دوسرے کے لئے ممکن نہیں، اسی لئے زبان سے اظہار رضامندی کو نکاح کے منعقد ہونے کے لئے کافی سمجھا گیا ہے، اب سوال یہ ہے کہ اگر کسی مرد یا عورت سے جبراً رضامندی کا اظہار کرالیا جائے تو کیا نکاح منعقد ہوجائے گا؟ — اس سلسلہ میں حنفیہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اکراہ کے ساتھ اگر قبولیت کے الفاظ کہلا دیئے جائیں تب بھی نکاح منعقد ہوجاتا ہے اور اس سلسلہ میں لڑکا اور لڑکی دونوں کا ایک ہی حکم ہے :

> **وأما ما ذكر من أن نكاح المكره صحيح إن كان هو الرجل ، وإن كان هو المرأة فهو فاسد فلم أرمن ذكره وإن أو هم كلام القهستانى السابق ذلك بل عبارتهم مطلقة فى أن نكاح المرأة المكره صحيح ، كطلاقه وعتقه مما يصح مع الهزل ، ولفظ المكره شامل للرجل والمرأة ، فمن ادعى التخصيص فعليه إثباته بالنقل الصريح . (۱)**

یہ نقطۂ نظر حنفیہ کے علاوہ بعض اور فقہاء کا بھی ہے (۲) پھر جن فقہاء کے نزدیک ولی کو باکرہ لڑکی پر ولایت اجبار حاصل ہوتی ہے، ان کے یہاں تو ویسے بھی لڑکی کی رضامندی کے بغیر ولی کا کیا ہوا نکاح اس کے اوپر لازم ہوجاتا ہے۔

ہندوستان میں مسلمان جس قوم کے پڑوس میں ہیں 'یعنی ہندو' ان کے یہاں نکاح میں لڑکی سے اجازت لینے کا تصور نہیں، اس سے متاثر ہوکر بعض علاقوں میں ایسے واقعات پیش آتے ہیں کہ مسلمان باپ دادا بھی اپنی لڑکیوں کا نکاح اپنی مرضی سے ان کی ناراضگی کے باوجود کردیتے ہیں، اس پس منظر میں ''مجمع الفقہ الاسلامی الہند''

---

(۱) ردالمحتار مع الدر المختار: ۸۷/۴، کتاب النکاح۔

(۲) دیکھئے: الموسوعة الفقهية: ۱۱۰/۶۔

نے اپنے تیرہویں سیمینار منعقدہ ۲۰۰۱ء میں اس مسئلہ پر بحث کی اور فیصلہ کیا کہ اگر چہ اس طرح کا نکاح فقہی اعتبار سے منعقد ہوجاتا ہے؛ لیکن اولیاء کا ایسے عمل کا ارتکاب کرنا قطعاً جائز نہیں، اگر اس طرح نکاح کردیا گیا اور لڑکی اس پر راضی نہ ہوتو وہ فسخ نکاح کا مطالبہ کرسکتی ہے اور قاضی شریعت اس کا نکاح فسخ کردے گا، اس کی دلیل حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی کا وہ مشہور واقعہ ہے جس کے مطابق صرف بیوی کی ناپسندیدگی کی وجہ سے آپ ﷺ نے حضرت ثابت کو طلاق دینے کا حکم فرمایا تھا، (۱) اسی طرح حضرت عبداللہ ابن عباس سے روایت ہے :

أن جارية بكرا أتت رسول الله صلى الله عليه وسلم فذكرت أن أباها زوجها وهى كارهة فخيرها النبى صلى الله عليه وسلم ۔ (۲)

عدمِ کفاءت کے باوجود نکاح

نکاح میں ایک اہم مسئلہ کفاءت کا ہے، کفاءت کا تعلق بنیادی طور پر عرف سے ہے، عرف میں بعض چیزوں کو سماجی اعتبار سے اونچ نیچ کا سبب مان لیا جاتا ہے، اگر اولیاء زیر ولایت لڑکی کا رشتہ نیچے سمجھے جانے والے لڑکے سے کردیں تو یہ لڑکی کے لئے باعث عار ہوتا ہے اور اگر نکاح کرنے والا ولی باپ یا دادا نہ ہوتو اس کو مطالبۂ تفریق کا حق حاصل ہے، (۳) اسی طرح اگر خود لڑکی اپنا رشتہ اپنے سے نیچی سطح کے لڑکے سے کرلے تو یہ بات اس کے اولیاء کے لئے بھی باعثِ عار سمجھی جاتی ہے؛ لیکن عرف چوں کہ ایک تغیر پذیر چیز ہے؛ اس لئے کفاءت کے معیارات بھی بدلتے رہتے ہیں، بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ لڑکی رشتہ کے انتخاب کے لئے کسی اور معیار کو ترجیح دیتی ہے، مثلاً ایک لڑکا خاندان کے اعتبار سے کم تر سمجھا جاتا ہو؛ لیکن اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہو اور معاشی اعتبار سے بہتر پوزیشن میں ہو تو بعض لڑکیاں تعلیمی اور معاشی معیار کو خاندان پر ترجیح دیتی ہیں، پس اگر لڑکی خود ایسا رشتہ کرلے جو غیر کفو میں ہو تو نکاح منعقد ہوجائے گا یا نہیں؟ اس سلسلہ میں حنفیہ کے یہاں دو قول ہیں، ایک یہ کہ نکاح منعقد ہوجائے گا؛ لیکن ولی کو اس پر اعتراض کرنے اور قاضی سے رجوع کرکے نکاح فسخ کرانے کا اختیار ہوگا، یہ ظاہر روایت ہے اور عام طور پر فتویٰ ظاہر روایت پر دیا جاتا ہے؛ لیکن متاخرین احناف کی رائے یہ ہے کہ ایسا نکاح منعقد ہی نہیں ہوگا اور بعد کے فقہاء نے اسی پر فتویٰ دیا ہے :

ويفتى فى غير الكفوء بعدم جوازه أصلا ، وهو الاختيار للفتوىٰ ۔ (۴)

---

(۱) بخارى : باب الخلع وكيف الطلاق فيه ؟ حدیث نمبر ۴۸۶۷، نسائى ، باب ماجاء فى الخلع۔

(۲) سنن ابوداؤد ، باب فى البكر يزوجها ابوها ولا يستأمرها، حدیث نمبر: ۱۷۹۴، سنن ابن ماجه ، باب من زوج ابنته ، وهى كارهة، حدیث نمبر: ۱۸۶۵۔ (۳) الفتاویٰ الہندیہ: ۲۸۵/۱، الدرالمختار: ۳۱۷/۲۔

(۴) ردالمحتار: ۲۱۷/۲، كذا فى البدائع: ۳۱۸/۲۔

موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ جیسے جیسے لڑکیوں میں تعلیم کی شرح بڑھ رہی ہے، وہ نکاح میں اپنے حق اختیار کو استعمال کرنا چاہتی ہیں اور تعلیم، معاشی معیار اور مزاج کی ہم آہنگی کو دوسری باتوں پر ترجیح دیتی ہیں، اس لئے بعض اوقات اولیاء کے معیار کے لحاظ سے غیر کفو میں نکاح کر لیتی ہیں، اولیاء کو اگر چہ یہ رشتہ عدم کفاءت کی وجہ سے پسند نہیں ہوتا؛ لیکن جب نکاح ہو جاتا ہے تو وہ اس پر خاموش ہو جانے میں ہی اپنی عزت کا تحفظ محسوس کرتے ہیں، اب اگر متاخرین کے فتویٰ کو لیا جائے تو نکاح منعقد نہیں ہوا اور ان کی زندگی معصیت کی زندگی قرار پاتی ہے؛ چنانچہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی زیر نگرانی عالمی مسائل سے متعلق جو مجموعۂ قوانین مرتب ہوا ہے، اس میں اسی قول پر فتویٰ دیا گیا ہے، نیز مجمع الفقہ الاسلامی الہند نے بھی اپنے گیارہویں فقہی سیمینار منعقدہ ۱۹۹۹ء میں اجتماعی غور وفکر کے بعد یہ بات طے کی کہ اگر چہ لڑکوں اور لڑکیوں کو اپنے رشتوں کے انتخاب میں اولیاء کی رائے کو اہمیت دینی چاہئے؛ لیکن اگر عاقلہ بالغہ خاتون نے غیر کفو میں ولی کی رضامندی کے بغیر نکاح کر لیا تو یہ نکاح شرعاً منعقد ہو جائے گا؛ البتہ اولیاء کو قاضی کے یہاں مرافعہ کا حق حاصل ہوگا، اگر اولیاء اس نکاح پر خاموش ہو جائیں تو نکاح نافذ رہے گا۔

نکاح میں شرط

یہ ایک حقیقت ہے کہ عورت کی جسمانی کمزوری اور انفعالی کیفیت کا فائدہ اُٹھائے ہوئے بہت سی دفعہ ان کے ساتھ زیادتی کی جاتی ہے، مثلاً ایک بیوی کی موجودگی میں دوسرا نکاح کر لیا جاتا ہے؛ لیکن شریعت میں عدل کے جو احکام دیئے گئے ہیں، ان کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا، اس کے حل کے لئے اسلامک فقہ اکیڈمی نے اپنے آٹھویں فقہی سیمینار منعقدہ ۱۹۹۵ء میں ''**اشتراط فی النکاح**'' اور'' **اشتراط فی المهر** '' کے مسئلہ پر بحث کرائی، اشتراط فی النکاح سے مراد یہ ہے کہ ایسی شرطیں جن کا شریعت نے نکاح میں حکم بھی نہیں دیا ہے اور وہ شریعت کے احکام سے متصادم بھی نہیں ہیں؛ لیکن وہ کسی فریق کے مفاد میں ہوں تو ایسی شرطیں معتبر ہوں گی یا نہیں؟ جیسے عورت شرط لگائے کہ شوہر اس کی موجودگی میں دوسرا نکاح نہیں کرے گا یا اس کو میکہ میں رکھے گا یا اس کو اس کے شہر سے باہر نہیں لے جائے گا تو اس کا اعتبار ہوگا یا نہیں؟ —— ایک گروہ کے نزدیک ایسی شرطیں معتبر نہیں ہیں، صحابہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ائمہ متبوعین میں امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کا نقطۂ نظر یہی ہے(۱) دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ایسی شرطیں معتبر ہیں اور شوہر پر ان کا پورا کرنا واجب ہے، صحابہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، (۲) حضرت عبداللہ ابن

(۱) دیکھئے: مصنف ابن ابی شیبہ: ۲۰۰/۴، بداية المجتهد: ۵۹/۲، شرح مهذب: ۲۵۰/۱۶۔

(۲) مصنف عبدالرزاق: ۲۲۷/۶-۲۲۹۔

مسعودؓ(۱) بعد کے اہل علم میں مشہور قاضی، قاضی شریح (۲) اور ائمہ متبوعین میں امام احمد ابن حنبلؒ (۳) نیز محدثین میں امام بخاریؒ (۴) اور امام ابوداؤدؒ (۵) کا بھی یہی نقطۂ نظر ہے، ان حضرات کی دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ''یَـا أَیُّھَـا الَّـذِیْنَ آمَنُوْا أَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ'' (۶) اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد: ''أحق ما أو فیتم من الشروط أن توفوا به ما استحللتم به الفروج'' (۷) ہے۔

چنانچہ اس سیمینار میں ہندوستان کے علماء وارباب افتاء نے اس دوسرے نقطۂ نظر کو موجودہ حالات کے پس منظر میں قبول کیا ہے، یعنی نکاح کے وقت اگر ایسی باتوں کی شرط لگائی جائے کہ شریعت نے نہ ان کو لازم قرار دیا ہے اور نہ ان سے منع کیا ہے تو ایسی شرطوں کو پورا کرنا واجب ہے۔

اسی سے قریب تر دوسرا مسئلہ' نکاح میں مشروط مہر' مقرر کرنے کا ہے، مثلاً مہر یوں طے پائے کہ اگر مرد نے اِس منکوحہ کی موجودگی میں دوسرا نکاح کیا تو مہر بیس ہزار درہم ہوگا اور اگر دوسرا نکاح نہیں کیا تو دس ہزار درہم ہوگا تو مالکیہ اور شوافع کے نزدیک ایسی شرطوں کا اعتبار نہیں؛ بلکہ ایسی صورت میں مہر مثل واجب ہوگا، (۸) —— امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک یہ دونوں شرطیں معتبر ہوں گی، (۹) یہی نقطۂ نظر حنفیہ میں صاحبین کا بھی ہے، امام ابوحنیفہ کے نزدیک مہر کی جو مقدار پہلے ذکر کی گئی، وہ معتبر ہوگی اور جو بعد میں ذکر کی گئی، اس کا اعتبار نہیں، (۱۰) —— اسلامک فقہ اکیڈمی کا موجودہ حالات میں فیصلہ یہ ہے کہ اس مسئلہ میں صاحبین کی رائے کو قبول کرنا بہتر ہوگا، اس سے عورتوں کے حقوق کے تحفظ میں اور طلاق کے واقعات کو کم کرنے میں مدد ملے گی، جیسے یوں مہر مقرر ہو کہ اگر مرد نے اس عورت کی موجودگی میں دوسرا نکاح نہیں کیا یا اسے طلاق نہیں دیا تو مہر دو ہزار ڈالر ہوگا اور اگر اس کی موجودگی میں دوسرا نکاح کرلیا یا کبھی اِس بیوی کو طلاق دے تو مہر دس ہزار ڈالر ہوگا، ایسی صورت میں شرط پوری نہ کرنے پر مرد کو مہر کی جو کثیر مقدار ادا کرنی پڑے گی، اس کا خوف کسی مناسب ضرورت کے بغیر دوسرے نکاح سے یا بلا سبب طلاق دینے سے اس کو باز رکھنے میں مؤثر ہوگی۔

ویسے امام ابوحنیفہؒ کے قول کے دائرہ میں رہتے ہوئے بھی اس مسئلہ کو حل کیا جا سکتا ہے؛ کیوں کہ امام صاحب کے یہاں اگر دو الگ شرطوں کے ساتھ مہر کی دو مقدار متعین کی جائے تو پہلی شرط اور اس سے مربوط مہر معتبر

(۱) شرح السنۃ: ۹/۵۴۔
(۲) مصنف عبدالرزاق: ۶/۲۲۴۔
(۳) المغنی: ۷/۱۷۔
(۴) دیکھئے: صحیح بخاری، باب الشروط فی النکاح۔
(۵) ابوداؤد، باب فی الرجل یشترط لہا دارا۔
(۶) المائدۃ: ۱۔
(۷) بخاری، حدیث نمبر: ۴۷۵۴۔
(۸) دیکھئے: شرح مہذب: ۱۶/۲۳۷۔
(۹) المغنی: ۷/۲۰۳۔
(۱۰) دیکھئے: البحر الرائق: ۳/۶، خلاصۃ الفتاویٰ: ۲/۳۷۔

ہوتا ہے اور اگر وہ شرط پائی جائے تو دوسری شرط معتبر نہیں ہوتی ؛ بلکہ اس کی بجائے مہر مثل واجب ہوتا ہے ؛ لہٰذا مثلاً یوں کہا جائے کہ اگر ہندہ کی موجودگی میں دوسرا نکاح کیا گیا تو مہر ایک لاکھ روپیہ ہوگیا اور نکاح نہیں کیا گیا تو مہر پچیس ہزار روپیہ ہوگا تو اس صورت میں اگر ہندہ کی موجودگی میں مرد نے دوسری شادی کی تو ہندہ کو ایک لاکھ روپیہ ادا کرنے پڑیں گے اور اگر اس کی موجودگی میں دوسرا نکاح نہیں کیا تو مہر مثل واجب ہوگا، اس طرح یہ مقصد کہ بیوی کو ناگوار صورتِ حال پیش آنے پر زیادہ مہر جائے، حاصل ہوجائے گا۔

سونا چاندی سے مہر کا تعین

عورتوں کے بعض حقوق جو ازدواجی زندگی سے متعلق ہیں، ان کے بارے میں بھی علماء ہند کے افکار قابل توجہ ہیں، ان میں ایک مسئلہ 'مہر' کا ہے، ہندوستان میں عام طور پر مہر مؤجل مقرر ہوتا ہے اور مروجہ کرنسی میں متعین کیا جاتا ہے، بدقسمتی سے اس وقت افراطِ زر اور حکومتوں کے بے حساب نوٹ چھاپنے کی وجہ سے کرنسی کی قیمت میں مسلسل اُتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے، مثال کے طور پر اگر آج سے بیس سال پہلے کسی عورت کا مہر انڈین کرنسی میں دس ہزار روپے طے ہوا تو اس میں سو گرام سونا خرید کیا جاسکتا تھا، اگر آج دس ہزار روپے بیوی کو ادا کیا جائے تو وہ اس میں پانچ گرام سونا بھی نہیں خرید کرسکتی، اس صورتِ حال کی وجہ سے عورت غیر معمولی مالی مضرت سے دوچار ہوتی ہے، اب یہ مسئلہ موجودہ فقہاء کے درمیان مختلف فیہ ہے کہ کرنسی کی حیثیت بعینہٖ ثمن کی ہے یا وثیقۂ ثمن کی؟ اور دیونِ متاخرہ کی ادائیگی میں جتنے نوٹ طے شدہ ہیں، اتنی ہی تعداد میں نوٹ کی ادائیگی ضروری ہوگی یا اس کرنسی کی جو قدر تھی، اس کے مطابق پیسوں کا ادا کرنا ضروری ہوگا؟ —— بعض حضرات کی رائے ہے کہ کرنسی کی قوت خرید کا اعتبار ہوگا نہ کہ اس کی تعداد کا؛ کیوں کہ شریعت میں عدل کا حکم دیا گیا ہے اور عدل کا تقاضا اسی طرح پورا ہوسکتا ہے، گویا ان حضرات کے نزدیک کرنسی وثیقۂ ثمن ہے، خود ثمن نہیں —— دوسری رائے اس کے برعکس ہے، اور شبہ ربا سے بچنے کے لئے اس دور کے جمہور علماء کی رائے یہی ہے کہ کاغذی کرنسی بجائے خود ثمن ہے اور ادائیگی میں صرف نوٹوں کی تعداد معتبر ہوگی۔

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے اپنے تیسرے فقہی سیمینار منعقدہ ۱۹۹۰ء میں کاغذی کرنسی کی شرعی حیثیت پر غور وفکر کرتے ہوئے فیصلہ کیا ہے کہ مہر مؤجل نوٹوں میں مقرر کرنے کے بجائے سونے یا چاندی میں مقرر کیا جائے ؛ تاکہ جب بھی مہر ادا ہو مہر کی قدر اور قیمت خرید میں کمی واقع نہ ہو اور عورت کے ساتھ عدل کے تقاضے پورے ہوسکیں۔

جہیز وتلک

جیسے عالم عرب میں ایک نامناسب رواج یہ ہے کہ لڑکیوں کے اولیاء، ہونے والے داماد سے خطیر رقم کا مطالبہ کرتے ہیں، اس مطالبہ کی وجہ سے بڑی تاخیر سے لڑکیوں کا نکاح ہو پاتا ہے ؛ بلکہ بعض تو تجرد کی حالت میں

پوری زندگی گذار دیتی ہیں؛ کیوں کہ اتنی بڑی رقم مہیا کرنا پیغام دینے والے لڑکوں کی قدرت سے باہر ہوتا ہے، اسی طرح ہندوستان میں ہندو معاشرت سے متاثر ہونے کی وجہ سے شادی کے وقت لڑکیوں کو جہیز دینے اور لڑکے اور اس کے سرپرستوں کی طرف سے خطیر رقم یا اس رقم کی چیز کے مطالبہ کا جاہلانہ رواج عرصہ سے موجود ہے؛ چنانچہ ہندوستان میں لڑکی کو جہیز کے نام پر تمام ضروریات زندگی اور داماد کو خطیر نقد رقم پیش کی جاتی ہیں، ہندوؤں کے یہاں اس کا پس منظر یہ ہے کہ ہندو مذہب میں عورتوں کے لئے میراث کا تصور نہیں، اس لئے جب لڑکیاں، ماں باپ کے یہاں سے رخصت کی جاتی ہیں تو انھیں یہ سب کچھ دے کر رُخصت کیا جاتا ہے؛ کیوں کہ آئندہ ان کو اپنے گھر سے کوئی چیز ملنے والی نہیں ہے، بدقسمتی سے مسلمانوں نے اس اثر کو قبول کرلیا ہے، بیٹیوں کو جہیز اور داماد کو تلک کے نام پر بڑی رقم ادا کی جاتی ہے؛ لیکن دوسری طرف لڑکیوں کو میراث سے محروم کردیا جاتا ہے اور جہیز وتلک کی رسم کی وجہ سے لڑکیوں کے نکاح میں خاصی تاخیر ہوتی ہے۔

ہندوستان میں علماء جہیز کے خلاف ذہن سازی کا کام وسیع پیمانہ پر کررہے ہیں، بہت سے علماء نے اس کے خلاف تحریریں لکھی ہیں اور اس کو رشوت قرار دیا ہے، جن میں مولانا محمد برہان الدین سنبھلی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ونائب صدر اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا) کی تفصیلی تحریر خاص طور پر قابل ذکر ہے، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے عائلی قوانین کا جو مجموعہ مرتب کیا ہے، اس میں بھی مطالبہ جہیز ونقد رقم کو ناجائز قرار دیا گیا ہے اور اسلامک فقہ اکیڈمی نے بھی اپنے تیرہویں فقہی سیمینار منعقدہ ۱۴۲۲ھ میں متفقہ فیصلہ کیا ہے کہ شرعاً نکاح میں لڑکی والوں سے کچھ لینا ——خواہ وہ کسی نام سے ہو—— جائز نہیں؛ بلکہ یہ ''**أحل لكم ماوراء ذلكم أن تبتغوا بأموالكم**'' (النساء:۲۴) کی روح کے خلاف ہے۔

حق میراث

ہندوستان میں شریعت اپلیکیشن ایکٹ ۱۹۳۷ء میں اس بات کو تسلیم کیا گیا ہے کہ اگر کسی معاملہ میں دونوں فریق مسلمان ہوں تو ان پر قانونِ شریعت کا اطلاق ہوگا؛ لیکن قانونِ میراث میں زراعتی اراضی کو اس سے مستثنیٰ کردیا گیا ہے، اسی طرح ہندوستان کی ایک بڑی ریاست یوپی میں زمین داری ایکٹ نافذ ہے، اس ایکٹ کے تحت بھی زراعتی اراضی میں خواتین کو میراث نہیں ملتی، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ جو ہندوستان میں تمام مسلمانوں کا ایک متفق علیہ پلیٹ فارم ہے اور جس کی قیادت علماء کے ہاتھوں میں ہے، وہ ایسے قوانین کو منسوخ کرانے کی کوشش کررہا ہے؛ تاکہ مسلمانوں پر شریعت کا قانون صحیح طور پر نافذ ہو، اسلامک فقہ اکیڈمی نے بھی اپنے تیرہویں فقہی سیمینار میں اس سلسلہ میں متفقہ تجویز منظور کی ہے۔

تفویض طلاق اور تحکیم

یہ بات ظاہر ہے کہ کہ شریعت میں طلاق کا اختیار مرد کو دیا گیا ہے، عورت کو اس کا اختیار نہیں دیا گیا ہے؛ تاکہ طلاق کے واقعات میں اضافہ نہ ہو اور مرد سے اس بات کی اُمید رہتی ہے کہ وہ قدرت کی طرف سے عطا کردہ قوتِ فیصلہ کو کام میں لائے ہوئے طلاق کے سلسلہ میں جلد بازی سے کام نہیں لے گا؛ کیوں کہ یہ ایک آزمودہ حقیقت ہے کہ اگر طلاق کا اختیار عورتوں کو مل جائے تو طلاق کے واقعات بڑھ جائیں گے، موجودہ مغربی معاشرہ میں مردوں اور عورتوں کو طلاق میں ایک ہی درجہ میں رکھا گیا ہے، اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ وہاں طلاق کی شرح نکاح کی شرح سے بڑھی ہوئی ہے؛ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض جفا خو اور ظالم شوہر ایسے ہوتے ہیں کہ عورت کا ان سے طلاق کا مطالبہ کرنا واجبی ہوتا ہے، جو شریعت کے مطابق بیوی کے حقوق بھی ادا نہیں کرتے اور طلاق یا خلع پر بھی آمادہ نہیں ہوتے؛ اس لئے بعض حالات میں ضرورت ہوتی ہے کہ عورت کے لئے طلاق کے حصول کو آسان بنایا جائے۔

اس کا ایک حل فقہاء حنفیہ کے یہاں ملتا ہے، جسے 'تفویض طلاق' کہا جاتا ہے، یعنی مرد عورت کو یہ حق دے دے کہ اگر وہ چاہے تو اپنے آپ پر طلاق واقع کرلے، اگر ایجاب وقبول کے بعد تفویض طلاق ہو تو تمام ہی فقہاء کے نزدیک اس کا اعتبار ہے؛ لیکن حنفیہ کے نزدیک اگر نکاح سے پہلے نکاح کی شرط کے ساتھ حق طلاق تفویض کیا جائے تب بھی تفویض طلاق درست ہوتی ہے: ''**ولو قال الزوج : تزوجتک علی أنک طالق بعد التزوج أو أن أمرک بیدک بعد التزوج فقبلت المرأة صار الأمر بیدها**''(۱) اس لئے ہندوستان کے ایک بصیرت مند فقیہ اور جامع علمی شخصیت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے غالباً سب سے پہلے یہ مشورہ دیا تھا کہ نکاح کے موقع پر ایک دستاویز 'تفویض طلاق' کا بھی مرتب کیا جائے، جس پر مرد دستخط کردے، آپ نے اپنی گرانقدر تالیف ''**الحیلة الناجزه**'' میں تفصیل سے اس کا ذکر کیا ہے، پھر اسے عام لوگوں تک پہنچانے کی غرض سے بگڑتے ہوئے سماجی حالات کے پس منظر میں اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے بھی اپنے سیمینار منعقدہ ۱۹۹۵ء میں شرکاء کے اتفاقِ رائے سے تفویض طلاق کے بارے میں تجویز منظور کی اور ہندوستان میں اسے رواج دینے کی اپیل کی۔

اسی کوشش کو آگے بڑھاتے ہوئے 'آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ' نے علماء کی ایک کمیٹی کے ذریعہ 'معیاری نکاح نامہ' مرتب کرانے کے لئے کمیٹی تشکیل دی، جس کے کنوینر پہلے حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ تھے اور ان کی وفات کے بعد یہ ذمہ داری اس حقیر سے متعلق کی گئی؛ چوں کہ عام طور پر لوگ تفویض طلاق کے لفظ سے

(۱) خلاصۃ الفتاویٰ: ۲/۲۹۔

وحشت محسوس کرتے ہیں اور خاص کر نکاح کے موقع پر طلاق کے تذکرہ کو پسند نہیں کرتے ،اس لئے اس نکاح نامہ میں ایک دفعہ 'تحکیم نامہ' کی شامل رکھی گئی ہے، جس پر دستخط کر کے عاقدین ''قاضی شریعت'' کو حکم بناتا ہے کہ اگر دونوں کے درمیان ازدواجی زندگی میں کوئی نزاع پیدا ہوتو قاضی یا مقررہ حاکم ہر طرح کا فیصلہ کرسکتا ہے —— یہ ایک وسیع دائرہ میں تحکیم ہے جس میں تمام ازدواجی مسائل میں قاضی یا حکم فیصلہ کا مجاز قرار پاتا ہے، ہندوستان جیسے ملک میں جہاں مسلمانوں کے دارالقضاء کو قانونی اعتبار حاصل نہیں ہے، اس تحکیم کے ذریعہ قانونی اختیارات حاصل ہوجاتے ہیں ؛ کیوں کہ ہندوستان میں (حَکَم) کو سیول مقدمات میں فیصلہ کے اختیارات حاصل ہیں اور وہ جو بھی فیصلہ کرے فریقین کے لئے قانوناً واجب العمل ہوتا ہے ؛ یہاں تک کہ عدالت میں اس فیصلہ کے خلاف مرافعہ بھی قبول نہیں کیا جاتا۔

حالت نشہ کی طلاق

طلاق کے سلسلہ میں ایک اہم مسئلہ حالتِ نشہ کی طلاق کے واقع ہونے اور نہ ہونے کا ہے،فقہاء کے ایک گروہ کی رائے ہے کہ حالت نشہ کی طلاق واقع ہوجائے گی ،صحابہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ،ائمہ متبوعین میں امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور ایک قول کے مطابق امام شافعیؒ اسی کے قائل ہیں ، دوسرا قول یہ ہے کہ حالت نشہ کی طلاق واقع نہیں ہوگی ،صحابہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، ائمہ متبوعین میں امام احمدؒ ، ایک قول کے مطابق امام شافعیؒ ، امام ابوحنیفہؒ کے اصحاب میں امام زفرؒ اور ان کے بعد کے مشائخ حنفیہ میں امام کرخیؒ اور امام طحاویؒ کا نقطۂ نظر یہی ہے،قرآن وحدیث میں اس مسئلہ سے متعلق کوئی صریح نص موجود نہیں ہے اور —— جیسا کہ مذکور ہوا —— آثارِ صحابہ میں اختلاف ہے۔

اگر غور کیا جائے تو وقوعِ طلاق کے قائلین کے پیش نظر یہ ہے کہ یہ طلاق دینے والے کی تعزیر ہے،اس کی وجہ سے اس کو تنبیہ ہوگی اور اگر وہ شخص ناواقف ہے تو چوں کہ دارالاسلام 'دارالعلم' ہے اس لئے اس میں جہل کا اعتبار نہیں —— اور جو لوگ عدم وقوع کے قائل ہیں ، ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ شریعت میں وہی تصرف معتبر ہے، جس کا صدور عقل وہوش کی حالت میں ہوا ہو، یہی وجہ ہے کہ خوابیدہ ، بے ہوش اور مجنون کی طلاق واقع نہیں ہوتی ؛ چوں کہ نشہ میں مبتلا شخص بھی قصور عقل کی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے؛ اس لئے اس کی طلاق بھی واقع نہیں ہونی چاہئے۔

دلائل سے قطع نظر ہندوستان کی صورتِ حال یہ ہے کہ اب یہ دارالاسلام نہیں ہے، دارالکفر ہے، جہالت اور دین سے ناواقفیت کا غلبہ ہے، نہ شراب کے بنانے پر پابندی ہے، نہ شراب کے بیچنے اور خریدنے پر اور نہ شراب کے پینے پر، دوسری طرف ہندوستانی معاشرہ میں لڑکی کا نکاح اور خاص کر کسی مطلقہ خاتون کا نکاح بے حد دشوار ہوتا ہے اور مرد کے لئے اسی قدر آسان ، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ طلاق دینے والا مرد تو دوسرے ہی دن شادی رچا سکتا ہے

اورطلاق پانے والی عورت پوری زندگی اپنی بے گناہی کی سزا جھیلتی رہتی ہے، اس پس منظر میں ہندوستان کے بعض اہل علم کی رائے یہ تھی کہ اس مسئلہ میں ہندوستان کے مخصوص حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے طلاق سکران کے عدم وقوع پر فتویٰ دیا جانا چاہئے، چنانچہ اس حقیر نے عرصہ پہلے اپنی کتاب 'جدید فقہی مسائل' میں اسی نقطۂ نظر کو پیش کیا تھا، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے اپنے سیمینار منعقدہ ۲۰۰۰ء میں اس موضوع پر بحث کی اور اہل علم کی ایک بڑی تعداد نے فیصلہ کیا کہ طلاقِ سکران واقع نہیں ہوگی، یہ فیصلہ بھی یقیناً عورتوں کے لئے سہولت کا باعث ہے؛ کیوں کہ حالتِ نشہ میں طلاق کے واقعات بہ کثرت پیش آتے رہتے ہیں۔

اسبابِ فسخ نکاح

ایک اہم مسئلہ فسخ نکاح کے اسباب کا ہے، حنفیہ کے یہاں اس پہلو پر زیادہ توجہ دی گئی ہے کہ نکاح زوجین کے درمیان دائمی تعلق کو چاہتا ہے اور غیر معمولی حالات میں ہی میاں بیوی کے درمیان علاحدگی ہونی چاہئے؛ اس لئے احناف کے یہاں اسبابِ فسخ کے سلسلہ میں نسبتاً سختی برتی گئی ہے، جب کہ جمہور فقہاء نے اس بات پر نظر رکھی ہے کہ مرد کو طلاق کا حق حاصل ہے اور وہ کبھی بھی بیوی سے چھٹکارا حاصل کرسکتا ہے، عورت کو طلاق کا حق حاصل نہیں؛ اس لئے اس کو دفع مضرت کی غرض سے فسخ نکاح کے مواقع حاصل ہونے چاہئیں؛ تاکہ اس کے لئے ظالم شوہر سے نجات حاصل کرنا آسان ہو۔

فقہ مالکی سے استفادہ

حنفیہ کے اقوال کے مطابق جن صورتوں میں فسخ نکاح کی اجازت ہے، ان کے علاوہ بعض صورتیں ہیں جن میں علماء ہند نے دوسرے فقہاء بالخصوص فقہاء مالکیہ کی رائے کو قبول کیا ہے، ان میں سے تین صورتوں کے بارے میں ہندوستان میں پہلی بار مشہور فقیہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اپنی رائے پیش کی، صورتِ حال یہ پیش آئی کہ فقہ حنفی میں فسخ نکاح کے دشوار ہونے کی وجہ سے بعض مسلمان عورتیں مرتد ہونے لگیں؛ تاکہ انھیں اپنے شوہر سے نجات حاصل ہو، اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے آپ نے ان مسائل پر حرمین شریفین میں موجود مالکی مفتیانِ کرام سے فتاویٰ طلب کئے اور ان سے گذارش کی کہ ان اسباب سے متعلق شرائط کو اچھی طرح منقح کردیا جائے، پھر آپ نے ان فتاویٰ کو مرتب کرکے ہندوستان کے طول وعرض میں موجود معروف علماء کے پاس بھیجا کہ وہ اس سلسلہ میں اپنی رائے دیں اور اہل علم کی تائید وتوثیق کے بعد اصل فتووں کے ساتھ اس کا اُردو ترجمہ ''**الحیلة الناجزة للحلیلة العاجزه**'' کے نام سے شائع فرمادیا، اس مجموعہ میں شوہر کے مفقود الخبر ہونے، شوہر کے غائب غیر مفقود ہونے، یعنی وہ بالکل لاپتہ تو نہ ہو؛ لیکن بھاگا بھاگا رہتا ہو اور کوئی ایک جائے قرار نہ ہو اور شوہر کے قدرت کے باوجود نفقہ ادا نہیں

کرنے کو فقہ مالکی کے مطابق سبب فسخ مانا گیا ہے۔

اس سلسلہ کو آگے بڑھایا ممتاز فقیہ حضرت مولانا عبدالصمد رحمانی نائب امیر شریعت بہار واڑیسہ نے، اور اس کا سبب یہ ہوا کہ امارتِ شرعیہ بہار کے تحت دارالقضاء کا نظام قائم ہے، مولانا رحمانی اس کے ذمہ دار تھے، اس لئے انھیں عملاً ان دشواریوں کا اندازہ ہوا، جن سے خواتین دوچار ہوتی ہیں، انھوں نے مذکورہ اسبابِ فسخ کے بہ شمول نو اسبابِ فسخ پر گفتگو کی اور اُردو زبان میں قضاۃ کے لئے نہایت ہی جامع تالیف ''کتاب الفسخ والتفریق'' مرتب فرمائی جو دریا بہ کوزہ کا مصداق ہے، اس میں بعض اسباب فسخ فقہ مالکی سے لئے گئے ہیں، بعض میں صاحبین کی رائے لی گئی ہے اور احناف کے یہاں جو اسبابِ فسخ تسلیم کئے گئے ہیں، ان میں بھی بعض تفصیلات وشرائط میں مصنف نے موجودہ حالات کے پس منظر میں فقہ مالکی سے استفادہ کیا ہے؛ چنانچہ حضرت مولانا عبدالصمد رحمانی نے فقہ مالکی سے ان تین اسبابِ فسخ کا اضافہ کیا ہے :

- جو شوہر نفقہ ادا کرنے سے عاجز ہو اور اپنی تنگ دستی کی بنیاد پر نفقہ ادا نہ کر پاتا ہو، بیوی کے مطالبہ پر اس کا نکاح بھی فسخ کر دیا جائے گا ۔
- شوہر کی طرف سے بیوی کے خصوصی حق کی عدم ادائیگی بھی سبب فسخ ہے، اگرچہ کہ وہ اس سے پہلے قربت کر چکا ہو۔
- شوہر کا بیوی کو تکلیف دہ حد تک مار پیٹ کرنا بھی اسبابِ فسخ میں ہے۔

صاحبین اور متاخرین کے اقوال سے استفادہ

شوہر کو جنون، جذام یا برص ہو تو امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک عورت فسخ نکاح کا دعویٰ دائر نہیں کر سکتی؛ لیکن امام محمد کے نزدیک عورت کو فسخ نکاح کا دعویٰ دائر کرنے کا حق حاصل ہے؛ چنانچہ فقہ حنفی کی معروف کتاب ہدایہ میں ہے :

> و إذا كان بالزوج جنون أو برص أو جذام فلا خيار لها عند أبي حنيفة وأبي يوسف وقال محمد لها الخيار دفعاً للضرر عنها كما في الجب والعنة ۔ (۱)

لیکن فقہاء متاخرین نے اس سلسلہ میں امام محمد کے قول کو ترجیح دی ہے (۲) اور علامہ قہستانیؒ نے اسی حکم میں ان تمام امراض وعیوب کو رکھا ہے کہ جن کے ہوتے ہوئے عورت اپنے شوہر کے ساتھ بہتر طور پر زندگی نہیں گزار سکتی؛ چنانچہ علامہ طحطاویؒ فرماتے ہیں :

(۱) هدايه ، باب العنين:۴۰۲۔ (۲) دیکھئے:الفتاویٰ الهنديه:۵۲۶/۱،باب العنين۔

وألحق بها القهستانی کل عیب لا یمکنها المقام معة الا بضرر ۔ (۱)

مولانا عبدالصمد رحمانی نے قہستانی کے اس قول کو قبول کیا ہے، نیز امام محمدؒ کے اس قول اور قہستانیؒ کی اس توضیح سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے آٹھویں فقہی سیمینار منعقدہ ۱۴۱۶ھ میں ایڈس کے مریض کے سلسلہ میں بہ شمول دوسری تجاویز کے ایک تجویز حسب ذیل منظور کی گئی :

اگر کوئی مرد ایڈس کا مریض ہو، مگر اس نے اپنا مرض ظاہر کئے بغیر کسی خاتون سے نکاح کرلیا تو ایسی صورت میں عورت کو فسخ نکاح کا حق حاصل ہوگا۔

بیوی کا حق جماع

⊙ احناف کے یہاں ایک مشہور مسئلہ یہ ہے کہ بیوی کا حق جماع زندگی میں ایک ہی دفعہ ہے، اگر ایک دفعہ شوہر نے بیوی سے ہم بستری کرلی اور اس کے بعد عنین ہوگیا تو اس کی بیوی فسخ نکاح کا دعویٰ دائر نہیں کرسکتی، یہی قول مشہور ہے اور اسی پر فتویٰ ہے، یہی حکم اس صورت میں بھی ہے، جب شوہر جماع پر قادر ہو اور ایک دفعہ قربت کرچکا ہو؛ لیکن اس کے بعد اس نے قطع تعلق کررکھا ہو: ''**ولو وطی مرة ثم عجز عن الوطی فی هذا النکاح لایکون لها حق الخصومة** ''(۲) مگر علامہ ابن نجیم مصریؒ کے بیان کے مطابق یہ نقطۂ نظر فقہاء کے ایک گروہ کا ہے کہ قضاءً صرف ایک بار جماع واجب ہے، اس کے بعد دیانتاً واجب ہے نہ کہ قضاءً؛ لیکن حنفیہ کے دوسرے گروہ کے نزدیک قضاءً بھی واجب ہے؛ چنانچہ علامہ شامی نقل کرتے ہیں :

قال فی البحر وحیث علم أن الوطئ لا یدخل تحت القسم ، فهل هو واجب للزوجة ؟ وفی البدائع لها أن تطالبه بالوطئ لأن حله لها حقها کما أن حلها له حقه وإذا طالبته یجب علیه ، ویجبر علیه فی الحکم مرة والزیادة تجب علیه فی الحکم ۔ (۳)

اس سے معلوم ہوا کہ ایک جماعت کے نزدیک عورت کی ضرورت کے مطابق جماع قضاءً بھی اس کا حق ہے، مولانا عبدالصمد رحمانیؒ نے اسی قول کو لیتے ہوئے ایک دفعہ بیوی سے قربت کے بعد اگر شوہر بیوی کو ضرر پہنچانے کے لئے ترک تعلق کرلے یا تعلق سے معذور ہوجائے، ہر دو صورت میں عورت کے لئے حق تفریق کو قبول کیا ہے۔

(۱) طحطاوی:۲/۲۱۳۔

(۲) شرح الوقایہ:۲/۶۵۔

(۳) ردالمحتار ، باب القسم:۲/۳۹۸۔

شقاق کی وجہ سے فسخ نکاح

⊙ مالکیہ کے نزدیک اگر مرد کی طرف سے زیادتی ثابت نہ ہو؛لیکن بیوی کو کسی بھی وجہ سے شوہر سے ایسی نفرت پیدا ہوگئی ہو کہ وہ اس کے ساتھ رہنے پر آمادہ نہیں ہو،جس کو قرآن مجید نے ’شقاق‘ سے تعبیر کیا ہے،تو قاضی حکمین کا تقرر کرے گا، یہ حکم پوری صورتِ حال کا جائزہ لیں گے اور پہلے دونوں میں موافقت پیدا کرنے کی کوشش کریں گے اور اگر موافقت پیدا نہ ہو پائے تو اگر زیادتی شوہر کی طرف سے محسوس ہو تو بیوی پر بلا کسی عوض کے طلاق واقع کردیں گے اور اگر زیادتی عورت کی طرف سے ہو تو عورت کی طرف سے مہر معاف کردیں گے اور شوہر کی طرف سے طلاق واقع کی جائے گی ،یعنی خلع کی صورت اختیار کی جائے گی ،مولانا عبدالصمد رحمانی نے مالکیہ کے اس قول کو قبول کرتے ہوئے اس کو’’ تفریق بہ سبب شقاق‘‘ سے تعبیر کیا ہے، بانی اسلامک فقہ اکیڈمی حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ — جو ایک کہنہ مشق اور بالغ نظر قاضی تھے — نے اس مسئلہ پر اپنے ایک مقالہ میں تفصیل سے بحث کی ہے اور دارالقضاء میں متعدد مقدمات اس اُصول پر فیصل کئے ہیں ، یہ فیصلے علمی اور فقہی دقتِ نظر کے اعتبار سے پڑھے جانے کے لائق ہیں ،مثلاً ایک مقدمہ میں شوہر نے اپنی بیوی کے بھائی کو قتل کردیا ،اگر چہ کہ خود بیوی کے ساتھ اس کا رویہ خراب نہیں تھا؛لیکن اس کی بیوی اپنے بھائی کے قاتل کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی تھی ،آپ نے ثالث کو حکم بنا کر ان کے درمیان تفریق کا فیصلہ فرمایا۔

دھوکہ دہی کی وجہ سے فسخ نکاح

⊙ ہندوستان میں مسلمانوں کے تمام مکاتبِ فکر کا سب سے نمائندہ پلیٹ فارم’ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ‘ ہے، بورڈ نے عائلی قوانین کا ایک مجموعہ مرتب کیا ہے؛ تا کہ وہ حوالہ کی کتاب کا کام دے سکے،اس کتاب میں ’ تغریر‘ کو بھی ایک سبب فسخ مانا گیا ہے،تغریر سے مراد یہ ہے کہ شوہر نے نکاح سے پہلے اپنی حیثیت کے بارے میں غلط باور کرایا ہو،مثلاً اس نے اپنے آپ کو ڈاکٹر،معلم یا کسی باعزت پیشہ سے متعلق شخص بتایا ہو؛مگر یہ بات غلط ثابت ہوئی، تو عورت فسخ نکاح کا مطالبہ کرسکتی ہے،اس کی بنیاد فقہاء کی بعض صراحتیں ہیں ،جیسے علامہ شامی کا بیان ہے :

> **لکن ظهر لی الآن أن ثبوت حق الفسخ لها للتغرير لا لعدم الكفائة ؛ بـد ليـل أنـه لـو ظهر كفوا يثبت لها حق الفسخ ، لأنه غرها و لا يثبت لـلاو ليـاء ؛ لأن التـغـريـر لـم يـحصل لهم ، وحقهم فی الكفاء ة وهی موجودة ۔ (۱)**

---

(۱) ردالمحتار:۱۷۶/۵،کتاب الطلاق۔

مفقود الخبر کی بیوی

اس سلسلہ میں یہ حقیر اپنی بعض آراء کے تذکرہ کی جسارت کرتا ہے جو اس نے اپنی کتاب ''جدید فقہی مسائل'' میں تحریر کی ہیں۔

⊙ اول یہ کہ اگر مفقود الخبر کا نکاح فسخ کر دیا جائے، اس نے دوسرا نکاح کر لیا پھر اس کا شوہر اول واپس آجائے تو اب وہ عورت کس کی زوجیت میں رہے گی؟ — امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک وہ شوہر اول کی بیوی سمجھی جائے گی اور اسی کی طرف واپس کر دی جائے گی، امام مالکؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک اگر شوہر ثانی کے دخول سے پہلے شوہر اول آجائے تب تو بیوی شوہر اول کی طرف لوٹائی جائے گی اور اگر اس کے بعد آیا تو شوہر اول کا اس پر کوئی حق نہیں ہوگا، (۱) جب کہ ربیعۃ الرائیؒ کے نزدیک جب قاضی نے شوہر اول کا نکاح فسخ کر دیا تو اب شوہر ثانی کا کوئی حق باقی نہیں رہا (۲) — اس حقیر کی رائے یہ ہے کہ اس سلسلہ میں امام مالک اور امام احمد کی رائے زیادہ قابل قبول ہے اور یہ اس صورت میں جب کہ مفقود الخبر شخص کوئی ایسی جائیداد چھوڑ کر گیا ہو، جس سے عورت کا نفقہ ادا ہو جاتا ہو، اگر شوہر نے نفقہ نہیں چھوڑا ہو اور عدم انفاق کی بنیاد پر نکاح فسخ ہوا ہو تو چوں کہ عدم انفاق کی بنیاد پر تفریق فقہاء کے نزدیک طلاق بائن کے حکم میں ہے؛ اس لئے عورت کا دوسرا نکاح ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، شوہر اول کا اب اس عورت پر کوئی حق نہیں۔

باپ دادا کے کئے ہوئے نکاح میں خیارِ بلوغ

⊙ دوسرا مسئلہ خیارِ بلوغ کا ہے، مالکیہ، شوافع اور حنابلہ کے نزدیک صرف باپ یا باپ اور دادا ہی کو نابالغ بچوں کے نکاح کا حق حاصل ہے اور اس طرح باپ یا دادا جو نکاح کر دیں، وہ ان پر لازم ہے، حنفیہ کے یہاں باپ اور دادا کے علاوہ دوسرے اولیاء بھی نابالغ کا نکاح کر سکتے ہیں؛ لیکن انھیں ولایت الزام حاصل نہیں ہے، یعنی ان کا کیا ہوا نکاح لازم نہیں ہوگا؛ بلکہ لڑکوں اور لڑکیوں کو بالغ ہونے کے بعد اس نکاح کو رد کر دینے کا اختیار حاصل ہوگا؛ البتہ باپ یا دادا کا کیا ہوا نکاح لازم ہوگا، سوائے اس کے کہ وہ معروف بسوء الاختیار یا فاسق متہتک ہو یا نشہ کی حالت میں نکاح کر دے :

> **أحدهما : إذا زوجهم الأب والجد ، فلا خيار لها بعد بلوغها بشرطين : أن لا يكون معروفاً بسوء الاختيار قبل العقد ، ثانيهما : أن لا يكون سكرانا فيقضى عليه سكره بتزويجها بغير مهر المثل أو فاسق أو غير كفوء ۔ (۳)**

(۱) دیکھئے: الميزان الكبرىٰ: ۹۱/۲، رحمة الامة: ۳۱۳۔ (۲) المحلى: ۱۳۸/۱۔
(۳) كتاب الفقه على المذاهب الاربعة: ۳۰/۴۔

نعم ، إذا كان متهتكا لا ينفد تزويجه إياها بنقص عن مهر المثل ومن غير كفوء ..... وحاصله أن العنين وإن كان لا يسلب الأهلية عندنا لكن اذا كان الاب لا ينفذ تزويجه الا بشرط المصلحة ۔ (۱)

لیکن قاضی ابوشریح کے نزدیک اگر باپ دادا نے نکاح کیا ہوتب بھی لڑکے اورلڑکی کو بالغ ہونے کے بعد دعویٰ تفریق کا حق حاصل ہے''إذا الرجل زوج ابنه أو ابنتهٔ فالخيار لهما إذا شبا ''(۲)—اس حقیر کی رائے میں موجودہ دور کی سوچ کو دیکھتے ہوئے قاضی شریح کی رائے قابل ترجیح معلوم ہوتی ہے۔

خیارِ بلوغ اور باکرہ

خیار بلوغ میں لڑکے کو اس وقت تک دعویٰ تفریق کا حق دیا گیا ہے، جب تک اس کی جانب سے نابالغی کے اس رشتہ پر رضامندی کا اظہار نہ ہوجائے ؛لیکن باکرہ لڑکی پر یہ بات ضروری قرار دی گئی ہے کہ وہ بالغ ہونے کے ساتھ ہی اپنی ناپسندیدگی کو ظاہر کردے؛ ورنہ اس کا حق خیار ختم ہوجائے گا، یہاں تک کہ بعض فقہاء نے تو لڑکی کو اس بات کی اجازت دی ہے کہ اگر وہ بروقت کسی کو گواہ بنانے پر قادر نہیں ہے تو بعد میں جب گواہ میسر آئے جھوٹ بولتے ہوئے کہہ دے کہ وہ ابھی بالغ ہوئی ہے اور حق خیار کا استعمال کرنا چاہتی ہے :

لا تصديق فى الإشهاد جاز لها أن تكذب كى لا يبطل حقها ۔ (۳)

مشرقی معاشرہ میں کسی باکرہ لڑکی سے اس بات کی توقع نہیں رکھی جاسکتی کہ وہ حیض آتے ہی اس بات کا اعلان کردے کہ میں ابھی بالغ ہوئی ہوں اور فلاں نکاح کو ناپسند کرتی ہوں ؛اس لئے لڑکوں اور ثیبہ عورتوں کی طرح باکرہ لڑکیوں کو بھی یہ حق حاصل ہونا چاہئے کہ جب تک قول یا فعل کے ذریعہ سابقہ نکاح پر اس کی رضامندی ظاہر نہ ہوجائے ،اس کو خیارِ بلوغ حاصل ہو، یہ موجودہ عرف کا تقاضا ہے۔

گذرے ہوئے دنوں کا نفقہ

نفقہ کے باب میں ایک قابل ذکر مسئلہ یہ ہے کہ اگر مرد نے ایک عرصہ تک نفقہ ادا نہیں کیا؛ حالاں کہ بیوی نے نفقہ معاف نہیں کیا تھا تو سوال یہ ہے کہ گذرے ہوئے دنوں کا نفقہ شوہر پر واجب ہوگا یا نہیں؟—اس سلسلہ میں فقہاء احناف کا عمومی رجحان یہ ہے کہ نفقہ اصل میں تبرع ہے نہ کہ عوض؛ اس لئے گذرے ہوئے دنوں کا نفقہ دو ہی صورتوں میں واجب ہوگا، یا تو پہلے سے قاضی نے نفقہ کا فیصلہ کردیا ہو اور فیصلہ کے باوجود شوہر نے نفقہ ادا نہیں کیا

(۱) ردالمحتار:۳۲۰/۳، باب الولی۔ (۲) مصنف ابن ابی شیبہ:۱۴۱/۴۔
(۳) عمدة الرعاية:۳۴/۲۔

ہوتو گذشتہ ایام کا نفقہ بھی واجب ہوگا، یا زوجین کے درمیان پہلے نفقہ کی ادائے گی کے سلسلہ میں کوئی معاہدہ ہوا ہو اورشوہر نے اس معاہدہ کے مطابق عمل نہیں کیا ہو، اگر قضاء قاضی یا صلح بالتراضی پہلے سے موجود نہ ہوتو گذرے ہوئے دنوں کا نفقہ واجب نہیں ہوگا،(۱) دوسرے فقہاء نفقہ کوشوہر کوحاصل 'حق احتباس' کا عوض قرار دیتے ہیں،اس لئے ان کے نزدیک گذرے ہوئے وقت کا نفقہ بھی واجب ہوگا، (۲) چنانچہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے مرتب کردہ ''مجموعۂ قوانین'' میں گذرے ہوئے دنوں کا نفقہ بھی واجب قرار دیا گیا ہے۔

علاج

اسی طرح ایک مسئلہ علاج کے نفقہ میں شامل ہونے اور نہ ہونے کا ہے،فقہاء عام طور پر یہ لکھتے آئے ہیں کہ بیوی کے علاج کی ذمہ داری شوہر پر نہیں ہوگی؛ کیوں کہ یہ نفقہ میں شامل نہیں ہے؛ چنانچہ حنفیہ میں علامہ ابن عابدین شامی کا بیان ہے :

کما لا یلزمه مداواتها أی إتیانه بدواء المرض ولا أجرة الطبیب ۔ (۳)

یہی بات فقہاء مالکیہ میں علامہ دردیر (۴) فقہاء شوافع میں امام نوویؒ (۵) اور فقہاء حنابلہ میں علامہ ابن قدامہ وعلامہ شرف الدین موسیٰ نے لکھی ہے۔(۶)

لیکن فقہاء کی یہ رائے غالبًا اس زمانہ کے حالات کے اعتبار سے تھی؛ کیوں کہ اس زمانہ میں علاج ومعالجہ میں کثیر اخراجات نہیں آتے تھے اور معمولی جڑی بوٹیوں سے علاج ہوجاتا تھا،فقہاء نے نفقہ کی تعریف ایسی چیزوں کی فراہمی سے کی ہے،جن پر انسان کی بقاء کا مدار ہو؛ چنانچہ علامہ داماد آفندی نفقہ کی شرعی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

ما یتوقف علیه بقاء شیئ من نحو مأکول وملبوس و سکنی ۔ (۷)

جس پر کسی چیز کا بقاء موقوف ہو، جیسے کھانا،لباس اور رہائش۔

اسی طرح علامہ شامیؒ فرماتے ہیں :

الادرار علی شیئ بما فیه بقاء ۔ (۸)

کسی کے لئے وہ چیز فراہم کرنا جس میں اس کی بقاء ہو۔

---

(۱) دیکھئے: ردالمحتار:۵/۳۲۱-۳۱۱،مجمع الانہر:۱/۴۹۱۔(۲) دیکھئے: حاشیۃ الدسوقی:۳/۴۹۲،روضۃ الطالبین:۹/۵۵،المغنی:۱۱/۳۶۶۔

(۳) ردالمحتار:۵/۲۸۵۔ (۴) دیکھئے:الشرح الصغیر:۲/۷۳۲۔

(۵) دیکھئے:روضۃ الطالبین:۹/۵۰۔ (۶) دیکھئے:الاقناع:۵/۹۴۸۔

(۷) مجمع الأنھر:۱/۴۸۴۔ (۸) ردالمحتار:۱/۷۷-۷۷۵۔

ظاہر ہے کہ انسان کی بقاء اور اس کی زندگی کے تحفظ میں دوا وعلاج کی اہمیت غذا اور لباس سے بھی زیادہ ہے، اس لئے یقیناً علاج بھی نفقہ میں شامل ہوگا اور جیسے خوراک اور پوشاک کا مہیا کرنا مرد کی ذمہ داری ہے، اسی طرح علاج کا نظم کرنا بھی بدرجۂ اولیٰ اس کی ذمہ داریوں میں شامل ہوگا — علماء ہند میں اسلامک فقہ اکیڈمی کے بانی حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ نے یہی نقطۂ نظر پیش کیا ہے اور اس حقیر نے بھی دارالقضاء میں بعض فیصلے اسی اُصول پر کئے ہیں کہ علاج نفقہ میں شامل ہے اور شوہر کے بہ شمول جن لوگوں پر کسی شخص کا نفقہ واجب ہو، ان کے ذمہ زیر پرورش شخص کا علاج بھی واجب ہے۔

دارالقضاء کا نظام

ایک اہم مسئلہ خواتین کے لئے اپنے حقوق کے حصول کا ہے، عدالت کی طویل کارروائیوں اور غیر مسلم قاضی کی جانب سے فسخ نکاح کے معتبر نہ ہونے کی وجہ سے ہندوستان جیسے مسلم اقلیت ممالک میں خواتین کے لئے اپنے حقوق کا حاصل کرنا نہایت دشوار ہوتا ہے، مسلمان غالباً پہلی بار اس صورتِ حال سے اسپین میں دوچار ہوئے، جہاں حکومت مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئی؛ لیکن مسلم آبادی کے چھوٹے چھوٹے جزیرے خاص خاص شہروں میں باقی رہ گئے، ان حالات میں غالباً سب سے پہلے علامہ ابن ہمام نے فتویٰ دیا کہ مسلمانوں کے لئے اپنے طور پر امیر اور قاضی کا تقرر واجب ہے :

> **و إذا لم يكن سلطان ولا من يجوز التقلد منه كما هو في بعض بلاد المسلمين غلب عليهم الكفار كقرطبة في بلاد المغرب الآن وبلنسية وبلاد الحبشة وأقروا المسلمين على مال عندهم يؤخذ منهم يجب عليهم أن يتفقوا على واحد منهم يجعلونه والياً فيولي قاضيا أو يكون هو الذي يقضي بينهم ۔ (۱)**

یہی بات بعد کے فقہاء میں علامہ محمد کردری نے 'الفتاویٰ البزازیہ علی ہامش الہندیہ' (کتاب السیر :۳۱۱/۶) امام ابن نجیم مصریؒ نے البحر الرائق (۲۹۸/۲) علامہ طحطاویؒ نے حاشیہ طحطاوی علی الدر (۳۳۹/۱) علامہ ابن عابدین شامیؒ نے ردالمحتار (کتاب القضاء :۳۰۸/۴، باب الجمعہ :۵۴۰/۱) میں لکھی ہے، ہندوستان کے علماء نے برطانوی استعماری دور میں عملی طور پر ہندوستان میں اس کو نافذ کیا؛ چنانچہ حضرت مولانا سید ابوالمحاسن محمد سجادؒ نے ہندوستان کی ایک بڑی ریاست بہار میں امارت شرعیہ کی بنیاد رکھی اور اس کے تحت دارالقضاء کا منظم اور مستحکم نظام قائم فرمایا، رفتہ رفتہ ہندوستان کی مختلف دوسری ریاستوں میں بھی اسی نظام کو اختیار کیا گیا اور اب 'آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ'

(۱) فتح القدیر:۳۶۵/۶۔

پورے ملک میں اس نظام کو فروغ دینے کے لئے کوشاں ہے اور اس کے لئے ایک مستقل ذیلی کمیٹی قائم ہے، دارالقضاء کا یہ نظام اگرچہ مسلمانوں کے تمام ہی نزاعات کو حل کرنے کے لئے ہے؛ لیکن اس کی وجہ سے سب سے زیادہ سہولت خواتین کو حاصل ہوتی ہے کہ ان کے مسائل کم وقت میں اور بہتر طور پر حل ہوجاتے ہیں، اس طرح یہ بھی خواتین کے مسائل کو حل کرنے کی ایک مثبت اور مؤثر کوشش ہے۔

خواتین کی ملازمت

گلوبلائزیشن کے موجودہ دور میں تجارت اور کاروبار نے غیر معمولی وسعت اختیار کرلی ہے اور اس لئے صنعتی انقلاب کے بعد مغرب اس بات پر مجبور ہوا کہ عورتوں کو گھروں سے باہر نکالا جائے اور انھیں بھی مزدوری میں اپنا حصہ ادا کرنے کو کہا جائے، ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ۱۸۱۴ء میں پہلی فیکٹری قائم ہوئی اور ۱۸۵۰ء تک فیکٹریوں میں مزدوروں کی تعداد میں ۲۴ فیصد حصہ خواتین کا ہوگیا، ۲۰۰۰ء کے اعداد وشمار کے مطابق یہاں ۱۶ سال سے اوپر کی ۶۰ فیصد خواتین کسی نہ کسی معاشی سرگرمی سے جڑی ہوتی ہیں اور امریکہ کی قوت کار میں ان کا حصہ ۴۷ فیصد ہے، ۱۹۹۰ء میں سویڈن میں کام کرنے والے افراد میں خواتین کا تناسب ۵۵ فیصد تھا، کم وبیش یہی صورتِ حال دوسرے مغربی ممالک میں ہے۔

سستے مزدور مہیا ہونے کے سبب اب تیزی سے کارخانے مشرقی اور ترقی پذیر ملکوں کی طرف منتقل ہورہے ہیں، اس کی وجہ سے انٹرنیشنل کمپنیوں کو سستا مال حاصل ہوتا ہے اور غریب ملکوں کو زیادہ روزگار، ہندوستان بھی ان ملکوں میں ہے، جو اس وقت معاشی ترقی کے اعتبار سے انتہائی بلندیوں کو چھورہا ہے، اس ترقی نے افرادی وسائل کی ضرورت کو بڑھایا اور شخصی زندگی کے معیار میں اضافہ کیا ہے؛ چنانچہ افرادی وسائل کی کمی کو پورا کرنے اور معیارِ زندگی میں مسابقت سے ہم آہنگ رہنے کی غرض سے ہندوستان میں بھی خواتین کے ملازمت کرنے کا رجحان بڑھتا جارہا ہے، مسلمان خواتین اگرچہ اس طرح کا رجحان کم رکھتی ہیں؛ لیکن اب بڑھتے ہوئے معاشی معیار کی وجہ سے مسلم خواتین بھی اس میدان میں قدم رکھ رہی ہیں۔

اس پس منظر میں 'اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا' نے اپنے اٹھارہویں فقہی سیمینار منعقدہ ۱۴۳۰ھ میں 'خواتین کی ملازمت' کا عنوان بھی رکھا اور خواتین کی ملازمت کے سلسلہ میں ایک ایسی متوازن تجویز منظور کی جس میں شرعی اُصولوں کی رعایت بھی ہے اور خواتین کے لئے معاشی جدوجہد کی گنجائش بھی؛ چنانچہ اس تجویز میں کہا گیا ہے کہ شرعی حدود وشرائط کا لحاظ کرتے ہوئے عورت کے لئے معاشی جدوجہد جائز ہے؛ البتہ اگر شوہر یا ولی عورت کی کفالت کررہا ہو تو کسبِ معاش کی غرض سے گھر سے باہر نکلنے کی صورت میں اس کی اجازت ضروری ہے۔

کلمۂ آخریں

یہ چند مسائل ذکر کئے گئے ہیں، جن کا تعلق موجودہ حالات اور علماء کے فقہی اجتہادات سے ہے؛ ورنہ ان کے علاوہ بہت سے کام وہ ہیں جو عورتوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے سماجی سطح پر کئے گئے ہیں، جیسے ہندو سماج سے متاثر ہونے کی وجہ سے بہت سے مسلمان مطلقہ اور بیوہ عورتوں کو منحوس سمجھتے ہیں اور ان کا نکاح نہیں کرتے، شاہ اسماعیل شہید اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند نے اس کے خلاف تحریک چلائی اور اس رسم کو توڑنے کی مؤثر کوشش کی، اسی طرح رواج کی بناء پر جہیز، لڑکے والوں کی طرف سے رقم یا اشیاء کا مطالبہ اور نکاح میں اسراف، نیز خواتین کو ان کا حق میراث نہ دینا اور معاشرہ میں عورتوں کے ساتھ ناروا سلوک کا ارتکاب، یہ وہ موضوعات ہیں جو اس وقت ہندوستان میں علماء کی اصلاحی کوششوں میں خصوصی ایجنڈہ کی حیثیت رکھتے ہیں، اسی طرح مغرب کی طرز سے خواتین کے ناموس سے کھیلنا، انھیں بے لباس کرکے اشتہار کی زینت بنانا اور ان کا استحصال کرنا وہ مسائل ہیں، جن پر ہمیشہ گفتگو کی جاتی ہے، غرض کہ یہ حقیقت ہے کہ علماء ہند نے خواتین کے حقوق کے تحفظ میں علمی اور اصلاحی جہت سے بڑی اہم خدمات انجام دی ہیں۔

دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلم سماج کو شریعت پر ثابت قدم رکھے اور مردوں اور عورتوں کو دو فریق کی حیثیت سے نہیں؛ بلکہ ایک وجود کے دو جز اور ایک دوسرے کے تکملہ کی حیثیت سے زندگی میں اپنا کردار ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے، کہ یہی اسلامی تعلیمات کی روح اور شریعت اسلامی کا مزاج ہے۔

وباللہ التوفیق وھو المستعان۔

▲▼ ▲▼ ▲▼